نیا نظامِ تعلیم

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" لاہور

قیمت ــــــــــــــــــ تین آنے

مطبوعہ دین محمدی پریس واقع سرکلر روڈ بیرون اکبری دروازہ لاہور سے
طبع کرا کر سید محمد شاہ پرنٹر پبلشر نے دفتر رسالہ ترجمان القرآن
لاہور سے شائع کیا

نیا نظامِ تعلیم

(یہ وہ خطبہ ہے جو ۵ر جنوری ۱۹۴۱ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی انجمن اتحاد طلبہ کے سامنے پڑھا گیا تھا)

حضرات! خوش قسمتی سے آج مجھے اُس جگہ اپنے خیالات کے اظہار کا موقع مِل رہا ہے جہاں موجودہ دَور میں سب سے پہلے اسلامی نظامِ تعلیم کی اصلاح کا تخیل پَیدا ہُوا، اور سب سے پہلا قدم اسکی طرف اُٹھایا گیا۔ اِسی وجہ سے مَیں نے اِس موقع کیلئے تعلیمی اصلاح ہی کے سوال کو اپنا موضوعِ بحث منتخب کیا ہے۔ میرے اس انتخاب میں ایک بڑا محرک یہ بھی ہے کہ اس وقت ہماری دینی درسگاہوں میں عمومًا اصلاحِ تعلیم کے مسئلے پر گفتگو چھڑی ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضرورت کا احساس تو پیدا ہو گیا ہے، مگر جس انداز سے یہ ساری گفتگو ہو رہی ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ اصلاح کی خواہش کرنے والوں کے ذہن میں مسئلہ کی نوعیت کا کوئی واضح تصور نہیں

ہے۔ لوگ اس گمان میں ہیں کہ پُرانی تعلیم میں خرابی صرف
اتنی ہی ہے کہ نصاب بہت پُرانا ہوگیا ہے اور اس میں
بعض علوم کا عنصر بعض علوم سے کم یا زیادہ ہے اور جدید
زمانہ کے بعض ضروری علوم اس میں شامل نہیں ہیں۔
اس لئے اصلاح کی ساری بحث صرف اس حد تک محدود ہو
کر رہ جاتی ہے کہ کچھ کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے کچھ
دُوسری کتابوں کو داخل کر دیا جائے، عناصر تعلیمی کے
تناسب میں ترمیم کر کے بعض اجزاء گھٹائے اور بعض
بڑہائے جائیں، اور قدیم علوم کے ساتھ تاریخ، جغرافیہ،
معاشیات اور سیاسیات وغیرہ علوم کی بھی کچھ کتابیں طلبہ
کو پڑہائی جائیں۔ ایسی ہی کچھ جزوی ترمیمات طرزِ تعلیم اور
انتظام مدارس میں بھی تجویز کی جاتی ہیں۔ اور بہت زیادہ
"روشن خیالی" پر جو لوگ اتر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صاحب
ہر مولوی کو میٹرک تک انگریزی پڑھا کر نکالو تاکہ کم از کم
تار پڑھنے اور لکھنے کے قابل تو ہو جائے۔ لیکن یہ جدت
جو آج دکھائی جا رہی ہے، یہ اب بہت پرانی ہو چکی ہے۔
اسکی عمر اُتنی ہے جتنی آپکے دار العلوم ندوۃ العلماء کی عمر

ہے۔ اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ
صرف یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ کامیاب قسم کے مولوی پیدا
ہو جائیں جو کچھ جرمنی اور امریکہ کی باتیں بھی کرنے لگیں۔
اس ذرا سی اصلاح کا یہ نتیجہ کبھی نہیں نکل سکتا کہ دنیا کی امامت
وقیادت کی باگیں علماء اسلام کے ہاتھ میں آجائیں، اور
وہ دنیا جو آج آگ کی طرف چلانے والے ائمہ Leaders کے
پیچھے چل رہی ہے، جنت کی طرف بلانے والے ائمہ کی رہبری
قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ نتیجہ اگر حاصل کرنا مقصود ہو
تو آپ کو مکمل انقلابی اصلاحات کے لیے تیار ہونا پڑے گا اور اس
سارے نظام تعلیم کو ادھیڑ کر از سر نو ایک دوسرا ہی نظام تعلیم
بنانا ہو گا۔ اس صحبت میں اس نئے نظام تعلیم کا نقشہ میں
آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں ✦

علم اور امامت کا رشتہ سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ اس دنیا
میں امامت و قیادت (leadership) کا مدار آخر ہے کس چیز
پر؟ کیا چیز ہے جس کی بنا پر کبھی مصر امام بنتا ہے اور دنیا اسکے پیچھے
چلتی ہے، کبھی بابل امام بنتا ہے اور دنیا اسکی پیروی کرتی ہے،
کبھی یونان امام بنتا ہے اور دنیا اس کا اتباع کرتی ہے، کبھی اسلام

قبول کرنے والی اقوام امام بنتی ہیں اور دُنیا انکے نقشِ قدم پر ہو لیتی ہے، اور کبھی یورپ امام بنتا ہے اور دُنیا اسکی متبع بن جاتی ہے؟ پھر وہ کیا چیز ہے جسکی وجہ سے امامت آج ایک کو ملتی ہے، کل اس سے چھن کر دُوسرے کی طرف چلی جاتی ہے، اور پرسوں اُس سے بھی سلب ہو کر تیسرے کیطرف منتقل ہو جاتی ہے؟ کیا یہ محض ایک بے ضابطہ اتفاقی امر ہے یا اس کا کوئی ضابطہ اور اصل مقرر بھی ہے؟ اس مسئلہ پر جتنا زیادہ غور کیا جائے اس کا جواب یہی ملتا ہے کہ ہاں اس کا ضابطہ ہے، اور وہ ضابطہ یہ ہے کہ امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا۔ انسان کو بحیثیت ایک نوع کے زمین کی خلافت ملی ہی علم کی وجہ سے ہے۔ اسکو سمع، بصر اور فواد، تین چیزیں ایسی دی گئیں ہیں جو دُوسری مخلوقاتِ ارضی کو یا تو نہیں دی گئیں، یا اسکی بہ نسبت کمتر دی گئیں ہیں۔ اسلیے وہ اس بات کا اہل ہوا کہ دوسری مخلوقات پر خداوندِ عالم کا خلیفہ بنایا جائے۔ اب خود اس نوع میں سے جو طبقہ یا گروہ علم کی صفت میں دُوسرے طبقوں اور گروہوں سے آگے بڑھ جائیگا وہ اُسی طرح ان سب کا امام بننے کا اہل ہوگا جس طرح انسان من حیث النوع دُوسری انواعِ ارضی پر اسی چیز کی وجہ سے خلیفہ بننے کا اہل ہوا ہے ٭

تقسیم امامت کا ضابطہ اس جواب سے خود بخود دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ علم سے مراد کیا ہے؟ اور اسمیں آگے بڑھنے اور پیچھے رہ جانے کا مفہوم کیا ہے؟ اس مسئلہ کا حل سمع، بصر اور فواد ہی کے الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ کلام الٰہی میں یہ تینوں لفظ مجرد سننے، دیکھنے اور سوچنے کے معنی میں استعمال نہیں ہوتے ہیں، بلکہ سمع سے مراد دوسروں کی فراہم کی ہوئی معلومات حاصل کرنا ہے، بصر سے مراد خود مشاہدہ کر کے واقفیت بہم پہنچانا ہے، اور فواد سے مراد ان دونوں ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کو مرتب کرنا اور نتائج اخذ کرنا ہے۔ یہی تین چیزیں مل کر وہ علم بنتا ہے جسکی قابلیت انسان کو دیگئی ہے۔ بر سبیل اطلاق اگر دیکھا جائے تو تمام انسان ان تینوں قوتوں سے کام لے رہے ہیں اور اسی وجہ سے مخلوقات ارضی پر خلیفانہ تسلط ہر انسان کو حاصل ہے۔ ذرا زیادہ تفصیل کیساتھ دیکھیے گا تو معلوم ہوگا کہ جو انسان انفرادی طور پر اور جو انسانی گروہ اجتماعی طور پر ان تینوں قوتوں سے کم کام لیتے ہیں وہ پست اور مغلوب رہتے ہیں، انہیں تابع اور مطیع بنکر رہنا پڑتا ہے ان کا کام پیچھے ہی چلنا ہوتا ہے۔ بخلاف اسکے جو ان تینوں سے زیادہ کام لیتے ہیں وہ برتر و غالب ہوتے ہیں، متبوع اور مطاع بنتے ہیں، رہنمائی و پیشوائی انہی کے حصہ میں آتی ہے۔ مگر امامت ملنے اور چھننے کا

ضابطہ معلوم کرنیکے لئے آپکو اس سے بھی زیادہ تفصیلی نگاہ ڈالنی ہوگی۔
اس تفصیلی نگاہ میں آپکو یہ حقیقت نظر آئیگی کہ ایک گروہ انسانوں کا
امام اُس وقت بنتا ہے جب وہ ایک طرف اُن معلومات کا زیادہ سے زیادہ
حصہ جمع کرتا ہے جو ماضی اور حال کے انسانوں سے حاصل ہو سکتی ہیں،
دُوسری طرف خود اپنے مشاہدہ سے مزید معلومات فراہم کرنے میں لگا رہتا
ہے، تیسری طرف ان دونوں قسم کی معلومات مرتّب کر کے نتائج اخذ کرتا
ہے اور پھر اُن نتائج سے کام لیتا ہے، پہلے کی جو چیزیں غلط ـــ کم از کم اس کے
اخذ کردہ نتائج کے لحاظ سے غلط ـــ ثابت ہوتی ہیں انکی اصلاح کرتا
ہے، پہلے کی جن چیزوں کا نقص ـــ کم از کم اسکے فہم کے لحاظ سے ـــ
اُس پر کھلتا ہے اُنکی تکمیل کرتا ہے، اور جو نئی چیزیں علم میں آتی ہیں،
اُن سے اپنی حدِ وسع تک زیادہ سے زیادہ کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔
یہ صفات جبتک اُس گروہ میں تمام دُوسرے انسانی گروہوں سے زیادہ
رہتی ہیں، وہی پُوری نوع کا امام ہوتا ہے اور جو ان صفات کے اعتبار سے
کمتر ہوتے ہیں انکے لیے اللہ کی امٹ تقدیر یہ ہے کہ وہ اسکی اطاعت
بھی کریں اور اتباع بھی ـــ اگر قسمت کی یاوری نے اطاعت سے بچا
بھی لیا تو انکے لیے اتباع سے تو کوئی مفر نہیں ہوتا، خواہ جان بُوجھ کر
بالارادہ کریں، خواہ بے جانے بُوجھے اضطراراً کریں ـــ اس دَورِ

عُروج کے بعد جب اس گروہ کے زوال کا وقت آتا ہے تو وہ تھک کر اور اپنے کیے ہوئے کام کو کافی سمجھ کر مشاہدہ سے مزید معلومات حاصل کرنے اور فواد سے مزید نتائج اخذ کرنے کی کوشش چھوڑ دیتا ہے، اور اس کا تمام سرمایۂ علمی صرف سمع سے حاصل شدہ معلومات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب اسکے لئے علم کے معنی صرف یہ جاننے کے ہو جاتے ہیں کہ پہلے جو معلومات حاصل کیگئی تھیں اور ان سے جو نتائج اخذ کیے گئے تھے وہ کیا تھے۔ اب وہ اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جو علم پہلے حاصل کیا جا چکا ہے وہ کافی ہے، اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں، پہلے جو نتائج اخذ کیے جا چکے ہیں وہ صحیح ہیں، ان میں کسی اصلاح و ترقی کا موقع نہیں، پہلے جتنی تعمیر ہو چکی ہے وہ مکمل ہے، نہ اس میں ترمیم ہی کی جا سکتی ہے اور نہ اس سے آگے مزید تعمیر ہی ممکن ہے۔

اس مرحلہ پر پہنچ کر یہ گروہ خود امامت سے ہٹ جاتا ہے اور نہ ہٹنا چاہے تو زبردستی ہٹا دیا جاتا ہے۔ پھر جو دوسرا گروہ مزید اکتسابِ علم، مزید اخذ نتائج، اور مزید تعمیر حیات کا عزم لیکر آگے بڑھتا ہے امامت و قیادت اس کا حصہ ہوتی ہے، اور وہ صاحب جو پہلے امام تھے اب مقتدی بنتے ہیں، جو پہلے مطاع و متبوع تھے اب مطیع و تابع بنتے ہیں، جو پہلے جیتے جاگتے علم کے مالک اور دُنیا کے استاد بنے ہوئے تھے اب

عجائب خانہ آثارِ قدیمہ میں بھیج دیے جاتے ہیں تاکہ بیٹھے علوم اوائل کی تشریح کرتے رہیں ٭

موجودہ "اسلامی نظامِ تعلیم کا" بنیادی نقص

اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امامت خواہ وہ آگ کیطرف لیجانے والی ہو یا جنت کیطرف بہرحال اس گروہ کا حصہ ہے جو سمع و بصر و فواد کو تمام انسانی گروہوں سے بڑھ کر استعمال کرے۔ یہ انسان کے حق میں اللہ کا بنایا ہوا اٹل ضابطہ ہے اور اس میں کوئی رورعایت نہیں ہے۔ کوئی گروہ خواہ خدا شناس ہو یا ناخدا شناس بہرحال وہ یہ شرط پوری کریگا تو دنیا کا امام بن جائیگا اور نہ کریگا تو مقتدی ہی نہیں بلکہ اکثر حالات میں مطیع بھی بننے سے نہ بچ سکے گا۔

آپکو جس چیز نے امامت کے منصب سے ہٹایا اور ناخدا شناس اہل مغرب کو اس پر لا بٹھایا وہ دراصل یہی ضابطہ ہے آپکے ہاں مدتہائے دراز سے علم کی جو حالت تھی اس میں بصر اور فواد دونوں معطل تھے اور سمع کا کام بھی صرف پہلے کی حاصل شدہ معلومات فراہم کرنے تک محدود تھا۔ بخلاف اسکے ناخدا شناس یورپ علم کے میدان میں آگے بڑھا اور اس نے سمع سے بھی آپ سے بڑھ کر کام لیا اور بصر و فواد کا کام تو پچھلی ڈہائی تین صدیوں میں تمام تر اسی نے انجام دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا اور یہی ہوا کہ وہ امام بن گیا اور آپ مقتدی بن کر رہ گئے۔ آپکی دینی تعلیم کے تمام مراکز

ابھی تک اپنی اُسی غلطی پر اَڑے ہوئے ہیں جس نے آپکو اس درجہ پر پہنچایا ہے۔
ان کے ہاں علم محض علوم اوائل کے پڑھنے پڑھانے تک محدود ہے۔ ندوہ
اور ازہر نے اصلاح کیطرف ایک قدم بڑھایا، مگر اس کا حاصل صرف اس قدر ہے
کہ سمع کا دائرہ حال کی معلومات تک بڑھا دیا جائے۔ بصر اور فواد پھر بھی معطل
کے معطل ہی رہے۔ اس علم کا فائدہ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ
یہی ہے، کہ آپ گھٹیا قسم کے نہ سہی بڑھیا قسم کے مقتدی بن جائیں۔ امامت
بہرحال آپکو نہیں مل سکتی۔ اس وقت تک جتنی اصلاحی تجویزیں میری
نظر سے گزری ہیں وہ سب کی سب بہتر مقتدی ہی بنانے والی ہیں۔ امام
بنانے والی کوئی تجویز ابھی تک نہیں سوجھی گئی حالانکہ دُنیا کی واحد خداشناس
جماعت ہونیکی حیثیت سے جو فرض آپکے ذمہ عائد ہوتا ہے اسکو آپ انجام نہیں
دیسکتے جبتک کہ آپ ناخداشناس لوگوں سے دُنیا کی امامت کا منصب چھین
کر خود اس پر قبضہ نہ کریں۔ اور اسکی کوئی صورت اسکے سوا نہیں ہے، کہ
آپ مجرد سمعی علم پر قناعت کا خیال چھوڑیں اور بصر و فواد سے نہ صرف کام لیں
بلکہ اس میں دُنیا کے تمام گروہوں پر فوق لے جائیں ۞

کس قسم کی اصلاح درکار ہے

یہ جو میں نے عرض کیا کہ "دُنیا کی واحد خدا
شناس جماعت ہونیکی حیثیت سے آپ پر جو فرض عائد ہوتا ہے اسکو آپ انجام
نہیں دیسکتے جبتک یہ کام نہ کریں"۔ یہ دراصل میری اس تمام بحث کا

مرکزی نکتہ ہے اسلیے میں اسکی مزید تشریح کردوں گا۔ اگر محض ایک انسانی گروہ ہونیکی حیثیت سے مطلقاً امام بننے کا سوال ہو تب تو آپکو کسی اصلاح تعلیم یا تجدید نظام تعلیمی کی ضرورت نہیں۔ سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی، یا مصر و ایران و ٹرکی کی سرکاری یونیورسٹیوں کے طرز تعلیم کے میدان میں پیشقدمی فرمایئے اور اُسی قسم کی امامت کے لیے امیدوار بن جایئے جیسی اس وقت یورپ اور امریکہ کو حاصل ہے اور جس کے لئے آپ کا جاپان مسابقت کر رہا ہے۔ مگر خدا شناس گروہ ہونیکی حیثیت سے آپکی یہ پوزیشن نہیں ہے۔ آپکی یہ پوزیشن ہر گز نہیں ہے، کہ آپ محض اپنے لیے امامت چاہتے ہوں، خواہ وہ امامت داعیۃ الی النار ہو یا داعیۃ الی الجنۃ۔ یورپ سے آپ کا جھگڑا اس بنا پر نہیں ہے، کہ دُنیا کا امام وہ نہ رہے اسکی جگہ آپ ہو جائیں۔ بلکہ اس سے آپ کا جھگڑا اصول اور مقصد کا جھگڑا ہے۔ وہ ناخدا شناسی بلکہ خدا سے بغاوت اور طغیان کی بنا پر دُنیا کی امامت کر رہا ہے اور آگ کیطرف ساری دُنیا کو لے جا رہا ہے۔ بخلاف اسکے آپ خدا شناس گروہ انسانی ہیں۔ خدا کی اطاعت آپ کے مسلک کی بنیاد ہے۔ آپ کے ایمان کی رُو سے آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ نہ صرف خود آگ کے راستہ سے بچ کر جنت کے راستہ پر جائیں بلکہ دُنیا کو بھی اسی راستہ پر چلائیں۔ اور یہ فرض آپ انجام نہیں دے سکتے جبتک کہ آپ اُس سے امامت چھین کر خود امام

نہیں۔ یہاں سوال نسلی یا جغرافی نہیں، خالص اصولی ہے۔ ناخدا شناسی کی امامت اگر ترک، یا ایرانی یا مصری یا ہندوستانی کی ہو تو وہ بھی اسی طرح مٹا دینے کے قابل ہے جس طرح فرنگی یا جاپانی کی۔ اور خداشناسی کی بنیاد پر جو امامت ہو وہی مطلوب ہے، خواہ اسکے علمبردار ہندی ہوں یا فرنگی یا کوئی اور *

ناخداشناس امامت کے نتائج کسی امام کے دعوتی اور عملی یا دعوتی طرز کے نتائج ہونے کا مدار بالکل اسکے خداشناس یا ناخداشناس ہونے پر ہے۔ جب کوئی ایسا گروہ جو خداشناس نہ ہو اپنے علمی اجتہاد کی بدولت دنیا کا امام بن جاتا ہے تو وہ تمام سمعی و بصری معلومات کو اس نقطۂ نظر سے جمع کرتا ہے اور اسی نقطہ نظر کے مطابق مرتب کرتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خدا نہیں ہے، انسان محض ایک غیر مسئول Irresponsible ہستی ہے، دنیا کی جو چیزیں اسکے لئے مسخر ہیں وہ سب اسکی ملک ہیں جن سے کام لینے کا مقصد اور طریقہ متعین کرنے میں وہ مختار محض ہے، اور اُسکی تمام سعی و جہد کا منتہائے مقصود اسکے سوا کچھ نہیں کہ اپنی خواہشات نفس کی خدمت کرے۔ معلومات کے اس اساس پر مرتب ہونے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ حکمتِ نظری اور حکمتِ عملی دونوں کا نشوونما خداپرستی کی بالکل مخالف سمت میں ہوتا ہے یہی حکمت تمام دنیا کے قلوب و اذہان پر چھا جاتی ہے۔ اسی سے خالص مادہ

پر ستاد اخلاقیات پیدا ہوتے ہیں، اسی پر انسان اور انسان کے درمیان تعلق کے تمام ضابطے بنتے ہیں، اسی کے مطابق انسان اپنی حاصل شدہ قوتوں کا مصرف معین کرتا ہے، اور فی الجملہ ساری انسانی زندگی کا بہاؤ اس راستہ کی طرف چل پڑتا ہے جسکی آخری منزلوں پہنچ کر اس دُنیا ہی سے عذاب جہنم کی ابتدا ہو جاتی ہے جیسا کہ آج آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ناخدا شناس حکمت جبتک دُنیا کے افکار، اخلاق، تمدن ہر چیز پر چھائی رہتی ہے، خدا شناسی کے نقطہ نظر اور اس اخلاق و تمدن کیلئے جو اس نقطۂ نظر پر مبنی ہو، زمین و آسمان کے درمیان کوئی جگہ نہیں رہتی۔ لوگوں کے سوچنے کا انداز اُسکے خلاف ہوتا ہے، طبائع کی افتاد اور مزاجوں کی پسند اسکے خلاف ہوتی ہے انسانی معلومات کی بگڑی ہوئی ترتیب اسکے خلاف شہادت دیتی ہے، اخلاق کے سارے اصُول اور قدر و قیمت کے سارے معیار اُس سے منحرف ہو جاتے ہیں، زندگی کے تمام ضابطے اور انسانی سعی و عمل کے سارے ہنگامے اسکو اپنے درمیان جگہ دینے سے انکار کر دیتے ہیں، اور اس صُورت حال میں صرف یہی نہیں ہوتا کہ خدا پرستی کے مسلک کی ہر چیز دُنیا میں نامقبُول و نامعقول ہو کر رہ جاتی ہے، بلکہ خود وہ لوگ جو اس مسلک کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں فی الواقع اسکی پیروی کر نہیں سکتے، زندگی کے دریا کا بہاؤ زبردستی کھینچ کر ان کو اپنے راستے پر لے جاتا

ہے، اور اسکے خلاف زیادہ سے زیادہ کشمکش وہ بس اتنی ہی کر سکتے ہیں کہ سر کے بل بہنے کے بجائے احتجاجاً پاؤں کے بل بہیں ؂

جو گروہ خیالات کے میدان میں امام بنتا ہے، اور جو کائنات فطرت کی طاقتوں کو اپنے علم سے مسخر کر کے ان سے کام لیتا ہے اسکی امامت صرف خیالات ہی کے عالم تک محدود نہیں رہتی بلکہ زندگی کے پورے دائرے پر چھا جاتی ہے۔ زمین پر اس کا تسلط ہوتا ہے۔ رزق کی کنجیاں اس کے قبضہ میں ہوتی ہیں۔ حاکمانہ اختیارات اسے حاصل ہوتے ہیں۔ اسلیے انسانی حیات اجتماعی کا سارا کاروبار اُس ڈھنگ اور اس نقشے پر چلنے لگتا ہے جس پر وہ گروہ اپنی ذہنیت اور اپنے زاویۂ نظر کے مطابق اُسے چلانا چاہتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ گروہ جسکو یہ تسلط دنیا اور اسکے معاملات پر حاصل ہے، خدا سے پھرا ہوا ہو تو اسکے حیطۂ اقتدار میں رہتے ہوئے کوئی ایسا گروہ پنپ نہیں سکتا جو خدا کی طرف پھرنا چاہتا ہو۔ جس گاڑی میں آپ بیٹھے ہوئے ہوں اگر اُس کا ڈرائیور اُسے کلکتہ کی طرف لیے جا رہا ہو تو آپ کراچی کی طرف جا ہی کب سکتے ہیں۔ چار و ناچار آپکو اسی طرف جانا پڑیگا جدھر ڈرائیور جانا چاہتا ہے۔ آپ بہت بگڑیں گے تو اتنا کر لیں گے کہ اسی گاڑی میں بیٹھے ہوئے اپنا رُخ کلکتہ سے کراچی کیطرف پھیر لیں، اور برضا و رغبت

نہ سہی کشاں کشاں اُس منزل پر جا پہنچیں جو آپکی منزلِ مقصود کے عین مخالف سمت میں واقع ہے *

موجُودہ صورتِ حال | یہی صورتِ حال اِس وقت فی الواقع درپیش ہے۔

آپکے امامت سے ہٹنے کے بعد یورپ نے علم کے میدان میں پیشقدمی کی تو ناگزیر اسباب نے اسکی نگاہ کا زاویہ خدا سے بیزاری Theophobia کیطرف پھیر دیا۔ اسی نقطۂ نظر سے اس نے تمام سمعی معلُومات کو جمع کیا، اسی نقطۂ نظر سے اس نے آثار کائنات کا مشاہدہ کیا، اسی نقطۂ نظر سے اس نے معلُومات کو مرتب کر کے نتائج اخذ کیے، اسی نقطۂ نظر سے اس نے زندگی کے مقاصد، اخلاق کے اصُول، تمدن کے ضوابط، اور انفرادی و اجتماعی برتاو کے ڈھنگ متعین کیے، اور اسی نقطۂ نظر سے اُس نے اُن تمام قوتوں کے مصرف تجویز کیے جو اسے تحقیق و اجتہاد کی بدولت حاصل ہوئی تھیں۔ پھر جب اس علم کے زیرِ پردہ اٹھا تو ایک طرف زمینیں کی زمینیں اور قومیں کی قومیں اسکے آگے مسخر ہوتی چلی گئیں، اور دوسری طرف وہی علم، وہی ذہنیت، وہی مقاصد و غایات، وہی فکری ساخت، وہی اخلاقی روش، وہی تمدنی قواعد و ضوابط، غرض وہی سب کچھ جو اِس امامِ غالب کے پاس تھا، تمام دُنیا پر چھا گیا۔ اب حال یہ ہے کہ ایک بچہ جب سے ہوش سنبھالتا ہے اُسی وقت سے اُسکے ذہن اور اسکی زندگی کی

تعمیر اُس نقشہ پر ہونے لگتی ہے جو یورپ کی امامت میں بنا ہے۔ سمعی معلومات اُسی ترتیب سے اُسکے دماغ میں اُترتی ہیں، مشاہدہ کیلئے وُہی نقطۂ نظر اُسے ملتا ہے، نتائج اخذ کرنے کی ساری تربیت اُسی طرز پر اُسے حاصل ہوتی ہے، حق اور باطل، صحیح اور غلط، مقبول اور مردود کی تعیین کیلئے وہی معیار اُسے میسر آتا ہے، اخلاق کے وُہی اصول، زندگی کے وُہی مقاصد اور سعی و عمل کے وُہی راستے اسکے سامنے روشن ہوتے ہیں، اپنے گرد و پیش زندگی کا سارا کارخانہ اُسی ڈھنگ پر اُسے چلتا ہوا ملتا ہے، اور جب وہ اسطرح پروان چڑھنے کے بعد خود کارگاہِ حیات میں حصہ لینے کیلئے تیار ہوتا ہے تو چونکہ یہی ایک مشین دُنیا میں چل رہی ہے، اور کوئی دوسری مشین چلنے والی موجود نہیں ہے، اِسلئے اسی کا پُرزہ اسکو بن جانا پڑتا ہے۔ ناخدا شناس تہذیب و تمدن کے اس کامل تسلط میں اوّل تو یہی سخت مشکل ہے کہ خدا پرستانہ نظریۂ حیات، مقصدِ زندگی اور اصول اخلاق کو دلوں اور دماغوں میں راہ مل سکے، کیونکہ علوم و فنون کی ساری ترتیب اور زندگی کی پوری روش اُسکے بالکل برعکس سمت میں بھری ہوئی ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگ ایسے بھی نکل آئیں جنکے ذہن میں یہ تخم جڑ پکڑ لے، تب بھی گرد و پیش کی پوری فضا اسکو غذا دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ اسکو نہ کہیں علوم سے تائید ملتی ہے، نہ

زندگی کے بنے اور جمے ہوئے نقشے اس کا ساتھ دیتے ہیں نہ دنیا کے چلتے ہوئے معاملات ہی میں کہیں اسکی جگہ نظر آتی ہے۔ جس قدر معلومات گزشتہ پانسو برس کی مدت میں انسان کو حاصل ہوئی ہیں انکو مرتب کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا سارا کام ناخداشناس لوگوں نے کیا ہے۔ خداپرستی کے نقطۂ نظر سے انکی ترتیب کا اور اخذ نتائج کا کوئی کام ہوا ہی نہیں۔ فطرت کی جو طاقتیں اس دوران میں انسان کیلئے مسخر ہوئیں اور قوانین طبیعی کی مزید دریافت سے جو فوائد حاصل ہوئے ان سے بھی خداپرستوں نے نہیں بلکہ خدا کے باغیوں نے کام لیا اس لیئے ناگزیر تھا کہ تمدن انسانی میں ان سب کا مصرف وہی مقرر ہوتا جو انکے مقاصد زندگی اور اصول اخلاقی کے مناسب حال تھا۔ اسی طرح اجتماعی معاملات کی تنظیم کے جتنے نظری خاکے اور عملی طریقے اس دوران میں سوچے اور عملاً چلائے گئے ان سب کے سوچنے اور چلانے والے وہ دماغ اور وہ ہاتھ نہ تھے جن پر خداپرستی کا مسلک فرمانروا ہوتا، بلکہ وہ تھے جو خدا کی اطاعت سے منحرف تھے، اسلئے نظریات اور عملیات کے میدان پر آج سارے کے سارے وہی نقشے چھائے ہوئے ہیں جو انہوں نے بنائے ہیں، اور ایسا کوئی نقشہ جو خداپرستانہ مسلک کی بنیاد پر بنا ہو، عملاً تو کیا موجود ہوتا، نظریہ کی شکل میں بھی

ایسی تفصیلی ترتیب کے ساتھ مرتب نہیں ہے جو آج کے حالات سے ربط کھاتا ہو اور جس میں آج کے مسائلِ حیات کا پورا پورا حل مل سکے۔ اب اگر اس مسلک پر اعتقاد رکھنے والا کوئی شخص راہب بن کر دُنیا اور اُسکی زندگی سے الگ تھلگ کسی گوشے میں جا بیٹھے اور اور پانسو برس پہلے کی فضا اپنے اوپر طاری کرلے تب تو بات دوسری ہے، ورنہ اِس دُنیا کے معاملات میں ایک زندہ انسان کی حیثیت سے حصّہ لینے کی صُورت میں تو قدم قدم پر اس کے لیے مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ اپنے مسلک میں نیک نیت اور صحیح الاعتقاد ہونیکے باوجود بارہا وہ نادانستہ اُن فکری اور عملی راہوں پر چل پڑتا ہے، اور بارہا اُسے مجبوراً اُن راہوں پر چلنا پڑتا ہے، جو اسکے مسلک سے بالکل مختلف ہیں۔ نئی معلومات جب اسکے سامنے آتی ہیں تو اسکے لئے سخت دُشوار ہوتا ہے کہ حقائق facts, کو اُن ناخداشناس لوگوں کے نقطۂ نظر اور اخذ کردہ نتائج سے الگ کرسکے جنہوں نے انکی دریافت، ترتیب اور استنتاج کا سارا کام انجام دیا ہے، اسلیے اکثر وہ اس طرح حقائق کیساتھ ساتھ انکے نظریات اور نتائج کو بھی ہضم کرجاتا ہے کہ اسے اس امر کا شعور تک نہیں ہوتا کہ امرت کے ساتھ کتنا زہر اسکے اندر اُتر گیا۔ اسی طرح زندگی

کے عملی معاملات سے جب اُسکو واسطہ پیش آتا ہے تو وہ سخت مشکل میں پڑجاتا ہے کہ کونسی راہ اختیار کرے۔ بہت سے اجتماعی نظریات جو فی الاصل اسکے مسلک کے خلاف ہیں، اسکے دل و دماغ پر زبردستی چھاجاتے ہیں، کیونکہ دُنیا میں ہر طرف چلن ہی ان کا ہے۔ بہت سے عملی طریقوں کو غلط سمجھنے کے باوجود محض اس بنا پر وہ اختیار کرتا ہے کہ ان سے ہٹ کر وہ کوئی دوسری راہ سوچ نہیں سکتا۔ اور بہت سی غلط راہوں پر اسے مجبوراً اسلیے چلنا پڑتا ہے کہ ان پر چلے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے ؛

انقلابِ امامت کیلئے انقلابِ تعلیم ناگزیر ہے | حضرات! یہ ہے وہ صورتِ حال جس میں اس وقت آپ مبتلا ہیں۔ میں نے اس صورتِ حال کا جو تجزیہ کیا ہے، اگر اس میں کوئی غلطی آپ پاتے ہوں، تو براہِ کرم مجھے بھی اس سے آگاہ فرمائیں تاکہ میں اس پر نظر ثانی کر سکوں۔ لیکن اگر یہ تجزیہ صحیح ہے تو اس سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں :-

اولاً، ناخداشناس ائمہ کی امامت میں رہ کر خداشناسی و خداپرستی کا مسلک زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہذا جو کوئی اس مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو اسکے عین ایمان و اعتقاد کا اقتضاء یہ ہے کہ

اس امامت کو مٹانے اور خدا شناس امامت کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے تیار ہو جائے ؛

ثانیاً، جو نظام تعلیم محض پرانے سمعی علوم کی حد تک محدود ہے اُس میں یہ طاقت ہرگز نہیں ہے کہ امامت میں اتنا بڑا انقلاب کرنے کیلئے آپکو تیار کر سکے۔ لہٰذا اگر آپ اس پر راضی ہوں کہ خدا پرستی کا مسلک بتدریج مٹتے مٹتے دُنیا سے فنا ہو جائے تب تو شوق سے اسی نظامِ تعلیم پر جمے رہیں، ورنہ اسے آپ کو بدلنا ہو گا ؛

ثالثاً، جو نظام تعلیم تمام علوم کو اُسی ترتیب اور اُسی زاویۂ نظر سے لیتا ہے جو نا خدا شناس ائمہ کی ترتیب اور اُن کا زاویہ نظر ہے اور جو اُس تمدنی مشین کا پرزہ بننے کیلئے انسانوں کو تیار کرتا ہے جو ان ائمۂ ضلال نے بنائی ہے، وہ دراصل ارتداد کا مجرب نسخہ ہے۔ اِس سے بڑھ کر کوئی فریب نہیں ہو سکتا کہ اس نوعیت کی کسی تعلیم گاہ پر مسلم یونیورسٹی، یا اسلامیہ کالج، یا اسلامیہ ہائی اسکول، کے الفاظ کا اطلاق کیا جائے۔ اور اس تعلیم کے ساتھ دینیات کے کسی کورس کو الگ سے لا کر جوڑ دینا ۹۵ فیصدی تو بالکل ہی لا حاصل ہے، اور ۵ فیصدی فائدہ اگر اس سے حاصل ہو بھی سکتا ہے

تو وہ بیش ازیں نیست کہ لوگ کچھ مدّت تک کفر کے راستہ پر خدا کا نام لیتے ہوئے چلتے رہیں ✚

رابعاً، اصلاح تعلیم کا یہ لائحہ کہ علوم اسلامی کے ساتھ نئے علوم کا جوڑ لگا یا جائے، یہ بھی امامت میں انقلاب کرنے کیلئے آپکو تیار نہیں کر سکتا۔ اسلیئے کہ فلسفہ، سائنس، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علوم جو اس وقت مدوّن و مرتّب صورت میں آپ کو ملتے ہیں وہ سب کے سب ناخدا شناس لوگوں کی فکر و تحقیق کا نتیجہ ہیں اور انکی ترتیب و تدوین میں اس گروہ کا نقطۂ نظر اس طرح پیوست ہے کہ حقائق واقعیہ کو نظریات اور اوہام و تعصبات اور اہواء ورحجانات سے الگ چھانٹ لینا اور خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے ان کو بطور خود مرتّب کر کے دوسرے نظریات قائم کرنا نہ ہر طالب علم کے بس کی بات ہے نہ ہر اُستاد کے بس کی۔ اب اگر آپ ایک طرف پرانے علوم کو پُرانی ترتیب کے ساتھ، اور نئے علوم کو اس خاص ترتیب کے ساتھ جو اس وقت پائی جاتی ہے، ملا کر پڑھائیں گے تو ان دو متضاد طاقتوں کے میل سے عجیب عجیب قسم کے مرکبات پیدا ہونگے۔ کوئی پُرانے علوم سے مغلوب ہوگا تو مولوی بن جائیگا۔ کوئی نئے علوم سے مفتوح ہوگا تو مسٹریت کی طرف چلا جائے گا،

بلکہ کامریڈیت تک جا پہنچے گا۔ کوئی دونوں کے درمیان مذبذب ہو کر مضمحل ہو جائے گا۔ بہت ہی کم آدمی اس نظامِ تعلیمی سے ایسے نکل سکتے ہیں جو دونوں قسم کے علوم کو جوڑ کر کوئی صحیح مرکب بنا سکیں، اور ان کا بھی اس قدر طاقتور ہونا بہت مشکل ہے کہ اُٹھ کر خیالات اور زندگی کے دھارے کو ایک طرف سے دُوسری طرف پھیر دیں ÷

یہ نتائج جو میں نے حالات کے تجزیہ سے اخذ کیے ہیں اگر ان میں کوئی غلطی ہو تو میں پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ مجھے اس سے آگاہ فرمائیں۔ لیکن اگر ان نتائج کو بھی آپ تسلیم کرتے ہیں، تو اب میں کہتا ہوں کہ امامت میں انقلاب کرنے کی اسکے سوا کوئی صُورت نہیں کہ ان تینوں نظاماتِ تعلیمی سے ہٹ کر ایک بالکل نیا نظامِ تعلیم بنایا جائے جس کا نقشہ ابتدائی تعلیم سے لیکر انتہائی مدارج تک تینوں سے مختلف ہو ÷

نئے نظامِ تعلیم کا خاکہ

اس انقلابی اصلاح کی ضرورت ثابت کرنے کے بعد میں اُس نظامِ تعمیر کا ایک خاکہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:۔

پہلی خصوصیت سب سے پہلی چیز جو اِس نئے نظام میں ہونی چاہیے، وہ یہ ہے کہ دینی اور دُنیوی علوم کی انفرادیت مٹاکر دونوں کو اس میں یکجان کر دیا جائے۔ علوم کو دینی اور دنیوی، دو الگ الگ قسموں میں منقسم کرنا در اصل دین اور دُنیا کی علٰحدگی کے تصور پر مبنی ہے، اور یہ تصور بنیادی طور پر غیر اسلامی ہے۔ اسلام جس چیز کو دین کہتا ہے وہ دُنیا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ دُنیا کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنا کہ یہ اللہ کی سلطنت ہے، اور اپنے آپ کو یہ سمجھنا کہ ہم اللہ کی رعیت ہیں، اور دنیوی زندگی میں ہر طرح سے وہ رویہ اختیار کرنا جو اللہ کی رضا اور اسکی ہدایت کے مطابق ہو، اسی چیز کا نام دین ہے۔ اس تصورِ دین کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام دنیوی علوم کو دینی علوم بنا دیا جائے۔ ورنہ اگر کچھ علوم دنیوی ہوں اور وہ خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے خالی رہیں، اور کچھ دُوسرے علوم دینی ہوں اور وہ دنیوی علوم سے الگ پڑھائے جائیں، تو ایک بچہ شروع ہی سے اس ذہنیت کے ساتھ نشو ونما پائیگا کہ دُنیا کسی اور چیز کا نام ہے اور دین کسی اور چیز کا۔ اُس کے لیے یہ دونوں دو مختلف عنصر ہوں گے اور ان کے درمیان توافق پیدا کر کے ایک ایسی ہموار زندگی بنانا مشکل ہو گا جو

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً کی مصداق ہو سکے ۔

مثال کے طور پر اگر آپ تاریخ، جغرافیہ، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، Biology، حیوانیات Zoology، ارضیات Geology، ریاضی، ہیئت astronomy، معاشیات Ecnomics، سیاسیات، اور دُوسرے تمام علوم ایک شخص کو اس طرح پڑھاتے ہیں کہ اول سے آخر تک کسی جگہ خدا کا نام نہیں آتا، نہ آفاق و انفس کے آثار پر اس حیثیت سے نظر ڈالی جاتی ہے کہ یہ آیات الٰہی ہیں، نہ قوانین طبیعی کا ذکر اس حیثیت سے کیا جاتا ہے کہ یہ ایک حکیم کے بنائے ہوئے قوانین ہیں، نہ واقعات کی توجیہ اس حیثیت سے کی جاتی ہے کہ ان میں کسی قادر و توانا کا ارادہ کام کر رہا ہے، نہ عملی علوم میں اس مقصد کا کہیں نشان پایا جاتا ہے کہ ان سے خدا کی رضا کے مطابق کام لینا ہے، نہ معاملات زندگی کی بحث میں اُس ضابطہ کا کہیں بیان آتا ہے جو اُن کو چلانے کے لئے خدا نے بتایا ہے، نہ سرگزشت حیات میں اس کے الٰہی مبدأ و غایت کی بحث کسی جگہ آتی ہے، تو علوم کے اس پُورے مجمُوعہ سے اس کے ذہن میں دُنیا اور اسکی زندگی کا جو تصوّر پیدا ہوگا وہ خدا کے

تصور سے بالکل خالی ہوگا، ہر چیز سے اس کا تعارف خدا کے بغیر ہوگا، اور ہر معاملہ میں وہ اپنا راستہ خدا اور اس کی رضا سے الگ بنائے گا۔ پھر جب تمام شعبوں سے یہ نقطۂ نظر اور معلومات کی یہ ترتیب لیے ہوئے ایک شعبہ میں جاکر وہ الگ سے خدا کا ذکر سنے گا، اور اُن مقاصد زندگی اور اُن قوانین اخلاقی اور اُن ضوابط شرعی کی تعلیم حاصل کریگا جنہیں آپ دینیات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، تو اسکی سمجھ میں نہ آئیگا کہ اس نقشہ میں خدا کو اور اس سے تعلق رکھنے والی ان ساری چیزوں کو کہاں جگہ دُوں۔ پہلے تو اسے خدا کی ہستی کا ثبوت ہی درکار ہوگا۔ پھر وہ اس بات کا ثبوت مانگے گا کہ مجھے اسکی ہدایت درکار بھی ہے اور اس کے پاس سے ہدایت آتی بھی ہے یا نہیں۔ اور ان سب باتوں کے بعد بھی اس کے لیے اپنی دنیوی معلومات کو اس نئی چیز کے ساتھ یک جان کرکے ایک ہمرنگ نقشہ بنانا مشکل ہوگا۔ وہ خواہ کتنا ہی پختہ ایمان لے آئے مگر بہرحال اس کے لیے دین عین اسکی زندگی نہ ہوگا بلکہ زندگی کا ایک ضمیمہ ہی بن کر رہ جائے گا۔

یہ ساری خرابی دینی اور دنیوی علوم کی تقسیم کا نتیجہ ہے اور

جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، یہ تقسیم بالکل اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔ نئے نظامِ تعلیم میں دینیات کے الگ کورس کی ضرورت نہیں، بلکہ سارے کورس کو دینیات کے کورس میں تبدیل کر دینا چاہیئے۔ شروع ہی سے ایک بچّہ کو دُنیا سے اس طرح رُوشناس کرائیے کہ گویا وہ خدا کی سلطنت میں ہے، اسکے اپنے وجُود میں اور تمام آفاق میں خدا کی آیات پھیلی ہوئی ہیں، ہر چیز میں وہ خدا کی حکمت اور قدرت کے آثار دیکھ رہا ہے، اس کا اور ہر شے کا براہِ راست تعلق خداوند عالم سے ہے جو آسمان سے زمین تک تمام معاملات دنیا کی تدبیر کر رہا ہے۔ دُنیا میں جتنی قوتیں اسکو حاصل ہیں اور جو اشیاء اس کے لئے مسخر ہیں، سب کی سب خدا نے اسکو دی ہیں، ان سب سے خدا کی مرضی کے مطابق اور اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر اسے کام لینا ہے اور اپنے اس کام کی جواب دہی خدا کے سامنے اس کو کرنی ہے +

ابتدائی مراحل میں تو کوئی دُوسرا نقطۂ نظر طالب علم کے سامنے آنا ہی نہیں چاہیئے۔ البتہ بعد کے مراحل میں تمام علوم اسکے سامنے اس طرح آنے چاہئیں کہ معلومات کی ترتیب،

حقائق کی توجیہہ اور واقعات کی تعبیر تو بالکلیہ اسلامی نقطۂ نظر
سے ہو، مگر اسکے مخالف دوسرے تمام نظریات بھی پوری تنقید و
تنقیح کے ساتھ اس حیثیت سے اس کے آگے رکھ دیئے جائیں کہ یہ
ضَالِّیْن اور مَغْضُوبِ عَلَیْھِم کے نظریات ہیں۔ اسی طرح عملی زندگی
سے تعلق رکھنے والے جملہ علوم کی بنیاد میں تو مقاصدِ حیات، اصولِ
اخلاق اور مناہج عمل اسلام کے پیوست کیئے جائیں اور دوسروں
کے اصول اور طریقے اس حیثیت سے طالب علم کو پڑھائے جائیں کہ
اُنکی فکری اساس، منزل مقصود اور راہ عمل اسلام سے کتنی اور
کِس کِس پہلو سے مختلف ہے۔ یہ طریقہ ہے تمام علوم کو دینی علوم
میں تبدیل کر دینے کا، اور جب اس طریقہ سے تعلیم دی جائے
تو ظاہر ہے کہ اس میں دینیات کے لیے کسی علیحدہ کورس
کی کوئی حاجت ہی نہیں پیش آسکتی ؎

دُوسری خصوصیّت دوسری اہم خصوصیّت جو اس نظام
تعلیمی میں ہونی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اس میں ہر طالب علم کو
مجموعۂ علوم بنانے اور تکمیل کے بعد ہر ایک کو "مولانا" اور ہر
ایک کو جملہ مسائل میں فتوے کا مجاز قرار دے دینے کا وہ طریقہ
جو اب تک رائج ہے، ختم کر دیا جائے، اور اسکی جگہ اختصاصی

تعلیم کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو سالہا سال کے تجربات کے بعد دُنیا میں مفید پایا گیا ہے۔ انسان کا علم اب اتنی ترقی کر چکا ہے، اور اتنے شعبے اس میں پیدا ہو گئے ہیں کہ کسی ایک شخص کا ان سب کو پڑھ لینا محال ہے، اور اگر تمام علوم میں محض معمولی سی شد بُود اُسے کرا دی جائے تو وہ کسی شعبۂ علم میں بھی کامل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بجائے بہتر یہ ہے کہ پہلے آٹھ یا دس سال کا کورس ایسا رکھا جائے کہ ایک بچے کو دُنیا اور انسان اور زندگی کے متعلق جتنی معلومات کم سے کم حاصل ہونی ضروری ہیں وہ اسکو خالص اسلامی نقطہ نظر سے دے دی جائیں۔ اس کے ذہن میں کائنات کا وہ تصوّر بیٹھ جائے جو مسلمان کا تصوّر ہونا چاہیئے، زندگی کا وہ خاکہ جم جائے جو ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہیے۔ عملی زندگی کے متعلق وہ تمام معلومات اسے حاصل ہو جائیں جن کی ایک آدمی کو ضرورت ہوتی ہے اور وہ ان سب چیزوں کو ایک مسلمان کے طریقہ پر برتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اسے اپنی مادری زبان بھی آ جائے۔ عربی زبان بھی وہ اتنی سیکھ لے کہ آگے مزید مطالعہ میں اسے مدد مل سکے۔ اور کسی ایک یورپین زبان سے بھی واقف ہو جائے تاکہ معلومات

کے اُس وسیع ذخیرے سے فائدہ اُٹھا سکے جو ان زبانوں میں موجود ہے۔ اسکے بعد اختصاصی تعلیم کے الگ الگ کورس ہوں جن میں چھ یا سات سال کی محققانہ تربیت حاصل کرکے ایک طالب علم اس شعبہ علم کا ڈاکٹر قرار دیا جائے جس کی تعلیم اس نے حاصل کی ہے۔ مثال کے طور پر مَیں چند شعبوں اور اُن کے طریق تعلیم کی تشریح کروں گا جس سے آپ اندازہ کرسکیں گے کہ میرے ذہن میں اس اختصاصی تعلیم کا کیا نقشہ ہے؛

ایک شعبہ فلسفہ اور علوم عقلیہ کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے۔ اس شعبہ میں طالب علم کو پہلے قرآن کا فلسفہ پڑھایا جائے، تاکہ اس ذریعہ سے وہ معلوم کرلے کہ انسانی حواس سے جو چیزیں محسُوس ہوتی ہیں اُن کی تہ میں حقائق کی جستجو کرنے کی کیا سبیل ہے، عقل انسانی کی رسائی کہاں تک ہے اور کن حدُود سے وہ محدُود ہے، مجرّد استدلال پر تخیلات کی عمارت کھڑی کرنے میں انسان کس طرح واقعات اور حقیقت کی دُنیا سے الگ ہو کر خیال کی تاریک دُنیا میں گم ہوجاتا ہے، مابعد الطبیعی امُور کے متعلق کتنا علم انسان کے لئے فی الواقع ضروری ہے،

اُس ضروری علم تک پہنچنے میں مشاہدہ observation اور استقراء Induction سے کس طرح کام لینا چاہیے، کن اُمور مابعد الطبیعت کا تعین ہم کر سکتے ہیں، کن کے متعلق ایک مجمل اور مطلق حکم سے آگے ہم نہیں بڑھ سکتے، اور کہاں پہنچ کر اجمال کو تفصیل سے بدلنے یا اطلاق کو تقیید میں تبدیل کرنے کی کوشش نہ صرف بے بنیاد ہو جاتی ہے بلکہ انسان کو تخیلات لاطائل کی بھول بھلیاں میں بھٹکا دیتی ہے۔ اس بنیاد کو مستحکم کر لینے کے بعد طالب علم کو تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کرایا جائے اور یہاں قرآنی فلسفہ کی مدد سے اسکو تمام مذاہب فلسفہ کی سیر کرا دی جائے تاکہ وہ خود دیکھ لے کہ حقائق تک پہنچنے کے جو ذرائع انسان کو دیے گئے تھے اُن سے کام نہ لے کر یا اُن سے غلط طریقہ پر کام لے کر کس طرح انسان بھٹکتا رہا ہے، کس طرح اُس نے اوہام کو حقیقت سمجھا اور اُس سے کس طرح اس کی زندگی متاثر ہوئی، کس طرح اُس نے اپنی پہنچ سے ماوراء چیزوں کے متعلق رجماً بالغیب حکم لگائے اور اس کے کیا اثرات زندگی پر مترتب ہوئے۔ کس طرح اُس نے اپنے حواس اور اپنی عقل کی حدود کا تعین کیے بغیر اُن حقیقتوں کا تعین کرنے میں اپنا وقت

ضائع کیا جن کا تعین اس کے بس کی چیز ہی نہ تھا، کہاں ہندو فلسفیوں نے ٹھوکر کھائی، کہاں سے یونانی فلسفہ بھٹک نکلا، کدھر مسلمان فلاسفہ قرآن کی بتائی ہوئی راہوں سے ہٹ کر نکل گئے، متکلمین کے مختلف اسکولوں نے صدیوں تک جن مسائل پر بحثیں کیں اُن میں قرآن کی رہنمائی سے کہاں کہاں اور کتنا کتنا تجاوز تھا، فلسفیانہ تصوف کے مختلف مذاہب نے مجمل کو مفصل اور مطلق کو مقید بنانے کی کس طرح کوششیں کیں اور وہ کس قدر غلط تھیں، یورپ میں فلسفیانہ تفکر نے کیا کیا راہیں اختیار کیں، ایک ہی حقیقت کی جستجو میں کتنے مختلف مذہب بن گئے، ان مختلف مذاہب میں حق کتنا ہے اور باطل کی آمیزش کتنی ہوئی اور کن راہوں سے آئی، کون سے مابعد الطبیعی تصورات ہیں جنہوں نے یورپ میں جڑ پکڑ لی ہے، اُن سے اخلاق و اعمال پر کیا اثرات مترتب ہوئے ہیں اور اگر کتاب اللہ کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھایا جاتا تو فضول دماغی کاوشوں میں وقت ضائع کرنے اور غلط بنیادوں پر زندگی تعمیر کرنے سے کس طرح دُنیا بچ سکتی تھی۔ اس تمام مطالعہ کے بعد طالب علم اپنی تحقیق کے نتائج مرتب کرے، اور جب اہل علم کی جرح و تنقید کے

کے بعد وہ اپنا کامل الفن ہونا ثابت کر دے تو اس کو فلسفہ میں فضیلت کی سند دے کر چھوڑ دیا جائے ؂

ایک دُوسرا شعبہ تاریخ کا ہونا چاہیے جس میں قرآن کا فلسفۂ تاریخ، مقصدِ مطالعۂ تاریخ اور طرزِ مطالعۂ تاریخ طالب علم کے ذہن نشین کرایا جائے تاکہ اس کے قلب سے تمام تعصبات نکل جائیں، وہ حقائق کو بے رنگ نگاہ سے دیکھنے اور ان سے بے لاگ نتائج اخذ کرنے کیلئے مستعد ہو جائے، نوعِ انسانی کی سرگزشت اور تہذیب انسانی کے نشوو ارتقا کا مطالعہ کر کے انسان کی فلاح وخسران اور سعادت وشقاوت اور عروج وزوال کے مستقل اصُول مستنبط کرے، مداولتہ ایام بین الناس جس ڈھنگ پر اور جس ضابطہ کے مطابق ہوتی ہے اسے معلوم کرے، جو اوصاف انسان کو اوپر اُٹھاتے ہیں اور جو اُسے نیچے گرادیتے ہیں اُن سے واقف ہو، اور خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلے کہ کس طرح فطرت کا ایک خط مستقیم ابتداء سے آج تک سیدھا کھنچا ہُوا نظر آتا ہے جو انسان کی ترقی کا اصلی راستہ ہے، اُس خط سے ہٹ کر جو بھی دائیں یا بائیں جانب دُور نکل گیا اُسے یا تو تھپیڑ کھا کر اُسی کی طرف پلٹنا پڑا ورنہ ایسا پھینکا

گیا کہ پھر اس کا کچھ پتہ نشان نہ ملا۔ اس طرزِ مطالعہ سے جب
طالب علم کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا کا قانون کس قدر بے لاگ
ہے اور کیسی غیر جانبداری کے ساتھ اس نے قوموں سے معاملہ
کیا ہے، تو کوئی قوم بھی نہ اسکی چاہیتی رہے گی اور نہ کسی کے
خلاف اس کے دل میں نفسانی عداوت کا جذبہ رہے گا جس
قوم کے کارنامے پر بھی وہ نظر ڈالے گا بے لاگ طریقے سے
ڈالے گا اور فلاح و خسران کے ابدی اصولوں کی کسوٹی پر کس
کر کھرے کو الگ اور کھوٹے کو الگ کر کے سامنے رکھ دیگا۔
اس ترتیب ذہنی کے بعد اُسے تاریخی دستاویزوں اور آثارِ
قدیمہ اور ماخذ اصلیہ سے بطور خود نتائج اخذ کرنے کی مشق کرائی
جائے، اور اتنا تیار کر دیا جائے کہ وہ جاہلی مورخین کے چڑھائے
ہوئے رنگوں سے اصل حقائق کو الگ کر کے خود بے لاگ رائیں
قائم کر سکے ÷

ایک اور شعبہ علوم عمران Social Sciences, کا ہونا
چاہیے، جس میں پہلے قرآن اور حدیث سے انسانی تمدّن کے
بنیادی اصول بتائے جائیں۔ پھر تفصیل کے ساتھ اصول
سے فروع کا استنباط کر کے اور انبیاء کی رہنمائی میں جو تمدن

بنے تھے اُن کے نظائر سے استشہاد کرتے ہوئے یہ بتایا جائے کہ ان قواعد اصلیہ fundamental principles پر کس طرح ایک صالح نظامِ معاشرت، نظامِ معیشت، نظامِ سیاست، تدبیر مملکت، اور تعلقات بین الاقوام کی عمارت اٹھتی ہے۔ پھر یہ بتایا جائے کہ کس طرح انہی اصُولوں پر اس عمارت کی مزید توسیع ہو سکتی ہے اور اجتہاد سے توسیع کا نقشہ مرتب کرنیکا کیا طریقہ ہے، اور انسانی علم کی ترقّی سے جو نئی قوتیں دریافت ہوتی ہیں اور تمدن کے فطری نشوونما سے جو نئے طرزِ عمل پیدا ہوتے ہیں ان سب کو اللہ کی مقرر کردہ حدوُد کے اندر رہتے ہوئے اس صالح تمدن میں جذب کرنے اور اپنے اپنے ٹھیک مقام پر رکھنے کی کیا صوُرت ہے۔ اس کے ساتھ ایک طرف طالب علم کو پچھلی قوموں اور مسلمانوں کی تمدنی تاریخ کا مطالعہ کرایا جائے تاکہ وہ دیکھے کہ تمدن کے ان اساسی اصُول اور الٰہی حدوُد کے قریب رہنے، اور ان سے انحراف کرنے سے کیا نتائج رُونما ہُوئے ہیں۔ اور دُوسری طرف اسے دَورِ جدید کے سیاسی معاشی اجتماعی نظریات وعملیات کا تنقیدی مطالعہ کرایا جائے تاکہ وہ یہ بھی دیکھ لے کہ انسان نے الٰہی ہدایت سے بے نیاز ہو کر بطور خود اپنی

زندگی کے لئے جو راستے تجویز کیئے ہیں وہ کہاں تک اُس کے لئے موجب سعادت یا شقاوت ہیں +

سائنس کی مختلف شاخوں کے لیے چند شعبے علیحدہ ہونے چاہئیں جن میں قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اب تک کی جمع شدہ سائنٹیفک معلومات کا جائزہ لیا جائے بلکہ آثار فطرت کے مزید مشاہدہ اور قوانین فطرت کی مزید دریافت کا کام بھی اُنہی خطوط پر کیا جائے جو قرآن نے کھینچ دیے ہیں۔ اگرچہ یہ کتاب سائنس کی کتاب نہیں ہے نہ اس کے موضوع کا براہ راست سائنس سے کوئی تعلق ہے، لیکن چونکہ یہ اُسی مصنف کی تصنیف ہے جس نے کائنات کو تصنیف کیا ہے اور وہ مُصنف اپنی ایک کتاب سے دوسری کتاب میں جگہ جگہ استدلال و استشہاد کا کام لیتا ہے، اس لئے اس کے گہرے مطالعہ سے سائنس کے ایک طالب علم کو نہ صرف نظام کائنات کا بُنیادی فارمولا معلوم ہو جاتا ہے، بلکہ قریب قریب ہر شعبۂ علم میں اسے ایک صحیح نقطۂ آغاز starting-point اور تلاش و تجسس کے لیے ایک صحیح رُخ Direction بھی ملتا ہے۔ یہ وہ شاہ کلید Master Key ہے جس سے سائنس کی ہر گتھی بآسانی

حل کی جا سکتی ہے، جس سے تحقیق کا سیدھا راستہ صاف کھل
جاتا ہے، جس کی مشکل کشائی سے اگر آدمی کام لے تو اُس کا
بہت سا وقت گتھیوں کے سلجھانے اور سلجھاتے سلجھاتے خود
اُلجھ جانے میں ضائع نہ ہو۔ موجُودہ سائنس کی گمراہی کا ایک
بڑا سبب یہ ہے کہ وہ حقائق واقعیہ کے مشاہدے کی حد تک
تو ٹھیک رہتا ہے، مگر جب ان حقائق کو جوڑ کر ان سے نظریات
بناتا ہے تو کائنات فطرت کے مبدأ و غایت سے ناواقف
ہونے کے باعث ٹھوکریں کھاتا چلا جاتا ہے، اور اس سے
نہ صرف بہت سی انسانی قوت فضول ضائع ہوتی ہے، بلکہ ان
غلط نظریات کو جب انسانی تمدن میں جذب کر کے عملیات کی
بنیاد اٹھائی جاتی ہے تو وہ فساد تمدن کی موجب ثابت ہوتی ہے
قرآن کی رہنمائی میں جب ایک مسلم سائنٹسٹ ثابت شدہ
حقائق کو نظریات سے الگ کر کے مرتب کرے گا اور مزید حقائق
دریافت کر کے اُن سے بہتر نظریات و نتائج نکال کر بتائے گا
تو کوئی وجہ نہیں کہ دُنیا ان سائنٹیفک گمراہیوں کو چھوڑنے
پر مجبُور نہ ہو جائے جن میں آج وہ مبتلا ہے +

جن علوم کو اس وقت علوم دینی کہا جاتا ہے ان کے لیے

بھی الگ شعبے مخصوص ہونے چاہئیں۔ مثلاً ایک شعبہ قرآن کے تحقیقی مطالعہ کا ہو جس میں پچھلے مفسرین کے کام کا جائزہ لینے کے بعد آگے مزید کام کیا جائے، مختلف پہلوؤں سے قرآن کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش کی جائے اور علوم انسانی کے تمام شعبوں سے استفادہ کر کے قرآن میں روز افزوں بصیرت حاصل کی جائے۔ اسی طرح ایک شعبہ علوم حدیث کا ہونا چاہیے جس میں قدیم محدثین کے کام سے پورا استفادہ کرنے کے بعد حدیث میں تحقیق، تنقید، ترتیب معلومات اور اخذ نتائج کا مزید کام کیا جائے، دور سعادت کے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیلات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی جائیں، اور ان سے وہ نتائج اخذ کئے جائیں جو اب تک ہمارے علم سے مخفی ہیں۔ ایک شعبہ قانون کا ہونا چاہیئے جس میں قرآن کے احکام، حدیث نبوی کی قولی و عملی تشریحات، صحابہ کرام اور تابعین کے اجتہادات، اور ائمۂ مجتہدین کے طرز استنباط اور جزئیات میں ان کی تفریعات کا مفصّل تحقیقی مطالعہ کیا جائے، نیز دُنیا کی دوسری پرانی اور نئی قوموں کے قوانین اور قانونی نظامات پر بھی گہری نظر رکھی جائے اور زندگی کے

روز بدلنے والے مسائل و معاملات پر اصول قانون اسلامی کو منطبق کر کے فقہ کے اُن چشموں کو پھر سے رواں کیا جائے جو صدیوں سے سُوکھ کر رہ گئے ہیں۔ یہ شعبے نہ صرف بجائے خود بہت عظیم الشان کام انجام دیں گے، بلکہ دوسرے تمام شعبوں کو بھی کتاب اللہ و سنت رسُول اللہ کے متعلق انہی سے وہ مواد ملے گا جس کی بنیاد پر علم کی تمام راہوں میں تحقیق و اکتشاف کا کام چلایا جائے گا۔

تیسری خصوصیت

مَیں نے یہ چند شعبے محض تمثیلاً بیان کیے ہیں جن سے پُورے نقشے کی تفصیلات کا ایک تصور بآسانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اب میں اس نئے نظام تعلیمی کی آخری مگر نہایت اہم خصوصیت کا ذکر کروں گا، اور وہ یہ ہے کہ اس میں وہ بے مقصد تعلیم نہیں ہوگی جو آج کل ہندوستان میں دی جا رہی ہے، بلکہ اس میں تعلیم دینے والے اور تعلیم پانے والے دونوں کے سامنے ایک متعین اور واضح مقصد زندگی اور منتہائے سعی و عمل ہوگا، یعنی یہ کہ ان سب کو مسلکِ خدا پرستی کی امامت دُنیا میں قائم کرنے کے لئے جہاد کبیر کرنا ہے۔ یہ مقصد اُس نظام کی ہر چیز میں اسی طرح کام کرے گا

جس طرح انسانی جسم کی ہر رگ اور ہر ریشے اور ہر حرکت میں اُس کی رُوح کام کرتی ہے۔ طلبہ کی شخصی زندگی، انکے باہمی اجتماعات، ان کے کھیل کُود اور تفریحات اور انکے درس و تدریس اور مطالعہ و تحقیق کے تمام مشاغل میں اسی مقصد کی کارفرمائی ہو گی اسی کے مطابق ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کی جائے گی، اسی پر ان کے اخلاق ڈھالے جائیں گے، اور تمام ماحول ایسا بنایا جائے گا کہ ہر شخص کو ایک مجاہد فی سبیل اللہ میں تبدیل کر دے۔

متوقع نتائج اس قسم کی تربیت اور اس قسم کی تعلیم پاکر جو لوگ تیار ہونگے ان میں یہ طاقت ہو گی کہ واقعات کی رفتار بدل دیں۔ انکی محققانہ تنقید، جاہلیت کے علوم اور جاہلی تہذیب کی ساری بنیادوں کو ہلا دے گی۔ انکے مدوّن کیے ہوئے علوم میں اتنا زور ہو گا کہ جو لوگ آج جاہلیت کے نقطہ نظر پر جمے ہوئے ہیں ان کو وہ اسلامی نقطۂ نظر کی طرف پھیر لائیں گے۔ ان کی تحقیق کے نتائج یورپ اور امریکہ اور جاپان تک کو متاثر کر دیں گے اور ہر طرف سے معقول انسان ان کے نظریات کی طرف کھنچتے چلے آئیں گے۔ ان کا مرتب کیا ہوا نظریۂ حیات اور لائحۂ زندگی اتنی قوت کے ساتھ فکر و نظر کی دنیا پر چھا

جائے گا کہ عمل کی دنیا میں اس کے خلاف کسی دوسرے لائحۂ زندگی کا چلنا مشکل ہوگا۔ پھر اسی تعلیم سے اُس سیرت اور اُس عزم کے لوگ پیدا ہوں گے جو امامت کے نظام میں عملاً انقلاب برپا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ وہ اس انقلاب کے فن کو بھی جانتے ہونگے، ان میں اس کے برپا کرنے کا مضبوط داعیہ بھی ہوگا، اور انہیں اپنی انقلابی تحریک کو خالص اسلامی راہوں پر چلانا بھی آتا ہوگا۔ پھر انہی میں یہ اہلیت بھی ہوگی کہ کامیابی کی منزل پر پہنچ کر اسلامی اصول کے مطابق ایک اسٹیٹ ایک مکمل نظام تمدن کے ساتھ بنا کھڑا کریں جسکی شکل اور رُوح اسلامی ہو اور جو دُنیا میں امامت کرنے کی پوری طاقت و صلاحیت رکھتا ہو۔

عملی مشکلات حضرات! اس مرحلہ پر پہنچ کر تین کٹھن سوالات سامنے آتے ہیں اور مَیں محسوس کرتا ہُوں کہ میرے یہ معروضات سننے کے دَوران ہی میں ان سوالات نے آپ کے دلوں میں خلش پیدا کرنی شروع کر دی ہوگی۔

نصاب اور معلمین کی تیاری پہلا سوال یہ ہے کہ یہ نیا نظام قائم کیسے کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ اس نئے طرز پر

نہ تو پڑھانے والے ہی اس وقت کہیں مل سکتے ہیں، اور نہ ایسی کتابیں ہی موجود ہیں جن سے کسی ایک شعبۂ علم کی تعلیم بھی اس نقشہ کے مطابق دی جا سکے، بلکہ شاید مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ پہلی جماعت کے بچے کو بھی اس طرز کی تعلیم دینے کے لئے کسی مدرس اور کسی کتاب کا ملنا اس وقت مشکل ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ایک نئی عمارت بنانے کے لئے بھٹہ تیار کرنا پڑتا ہے تاکہ اینٹیں پکائی جائیں اسی طرح ایک نیا نظام تعلیم بنانے کے لئے بھی ایک تربیت گاہ بنانا ضروری ہے تاکہ اس میں وہ آدمی تیار کئے جائیں جو اس خاص طریقہ کی تعلیم دینے کے قابل ہوں۔ اینٹیں بھی تو آپ کو پکی پکائی نہیں ملتیں۔ پکانی پڑتی ہیں۔ آدمی بھی آپکو بنے بنائے نہیں ملیں گے۔ بنانے پڑیں گے۔ اسی ناقص تعلیم سے کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی فارغ ہوکر نکلے ہیں جو فطرت ابراہیمی پر پیدا ہوئے ہیں۔ کافر گر تعلیم و تربیت کے سارے مرحلوں سے گزرنے کے باوجود اپنا ایمان بچا لائے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر اور مقصد زندگی اسلامی ہے یا ذرا سی محنت سے خالص

اسلامی بنایا جا سکتا ہے۔ ان میں یہ طاقت بھی موجود ہے کہ جس مقصد پر وہ ایمان لائے ہیں اس کی راہ میں جفاکشی کر سکیں۔ ان میں اجتہادی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ ایسے لوگوں کو لے کر اگر خاص قسم کی ذہنی و اخلاقی تربیت دی جائے، اور معلومات جس ترتیب سے اُن کے ذہن میں اب تک جمع ہوتی رہی ہیں اس کو ذرا حکمت کے ساتھ بدل دیا جائے، اور زاویۂ نگاہ اچھی طرح اسلام کی سمت میں جما دیا جائے، تو یہی لوگ تحقیق و مطالعہ سے اس قابل ہو سکتے ہیں کہ علوم کو میرے بیان کردہ نقشہ کے مطابق از سرِ نو مدوّن کرنا شروع کر دیں۔ پھر جب تدوین علوم کا کام کسی حد تک انجام پا جائے تو ایک نمونہ کی درس گاہ ابتدائی تجربوں کے لیے بنائی جا سکتی ہے، اور بعد میں آہستہ آہستہ اسے ترقی دے کر یونیورسٹی کے مرتبہ تک پہنچایا جا سکتا ہے +

متعلمین کی فراہمی دوسرا سوال یہ ہے کہ اس قسم کا نظامِ تعلیم اگر قائم بھی کر دیا جائے تو اس میں جاذبیت کونسی ہو گی جو پڑھنے والوں کو اس کی طرف کھینچے گی؟ جو نظامِ

تعلیم موجودہ نظاماتِ تمدن و سیاست کی خدمت کے لیے
نہیں بلکہ ان سے لڑنے کے لیے بنایا جائے اس میں شریک
ہونے والے کو یہ تو امید ہو ہی نہیں سکتی کہ کل وہ وہاں سے
نکل کر کچھ کما کھائے گا، پھر کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو
کمانے سے بے نیاز ہو کر اُس تعلیم کو حاصل کرنے کے لیے
آئیں گے جس کے بعد دُنیوی لحاظ سے کوئی شاندار مستقبل
نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم میں حق
اور صداقت کے سوا کوئی کشش نہیں ہے اور کسی دُوسری
کشش کی حاجت بھی نہیں۔ جن لوگوں کے لیے اس چیز
میں جاذبیت نہ ہو اور صرف روٹی ہی جن کو کھینچ سکتی ہو،
اُن کی توجہ فرمائی سے یہ نظامِ تعلیم خود بھی اتنا ہی بے نیاز
ہوگا جتنے وہ اِس سے بے نیاز ہیں۔ اس کے لیے تو وہ
لوگ درکار ہیں جو جان بُوجھ کر اُس مقصد اور اُس کام کے
لیے اپنی اور اپنے بچّوں کی زندگی وقف کرنے پر تیار ہُوں،
جس کے لیے یہ نظامِ تعلیم بنایا جائے گا۔ اور ایسے لوگ
بالکل ہی مفقود نہیں ہیں۔ تمام ہندوستان سے کیا پچاس
بچے بھی ہر سال اس کام کے لیے نہ مل سکیں گے؟ اگر اتنے

بچے بھی وہ قوم فراہم نہیں کر سکتی جو مدتوں سے اسلام اسلام چیخ رہی ہے تب بھی کچھ پروا نہیں۔ اللہ دوسری قوموں کو یہ سعادت بخشے گا۔

مال کا سوال تیسرا اور آخری سوال یہ ہے کہ اس کام کے لیے مال کہاں سے آئے گا؟ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ اُن لوگوں کے پاس سے جو مال اور ایمان دونوں رکھتے ہوں اور اتنی عقل بھی رکھتے ہوں کہ اپنے مال کا صحیح مصرف سمجھ سکیں۔ ایسے لوگ بھی اگر اس قوم میں نہ پائے گئے جو رات دن اسلام کے درد میں تڑپ رہی ہے تو مَیں پھر یہی کہوں گا کہ کچھ پروا نہیں، اللہ دوسری قوموں میں سے ایسے آدمی پیدا کرے گا۔ آخر پہلے بھی تو کفر و شرک ہی کی گود سے وہ اللہ کے بندے نکل کر آئے تھے جن کی مالی قربانیوں سے دُنیا میں اسلام کا فروغ ہوا۔

رسالہ ترجمان القرآن ماہوار

تمام ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی ماہوار رسالہ ہے۔ اس کا مقصد وحید اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ دنیا میں جو افکار و تخیلات اور اصول تہذیب و تمدن پھیل رہے ہیں اُن پر قرآنی نقطہ نظر سے تنقید کرنا اور فلسفہ و سائینس، سیاست، و معیشت، تمدن و معاشرت، ہر چیز میں قرآن و سنت کے پیش کردہ اصولوں کی تشریح کرنا۔ اور زمانہ جدید کے حالات پر ان اصولوں کو منطبق کرنا اس رسالہ کا خاص موضوع ہے +

یہ رسالہ امت مسلمہ کو ایک نئی زندگی کی دعوت دیتا ہے اور اسکی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ "اپنے دل و دماغ کو مسلمان بناؤ۔ جاہلیت کے طریقے چھوڑ کر اسلام کی صراط مستقیم پر چلو۔ قرآن لیکر اٹھو اور دنیا میں غالب بن کر رہو +

یہ رسالہ ۱۹۳۲ء سے باقاعدہ نکل رہا ہے۔ اور ہندوستان بھر کے مشہور رسالوں کی صف اول میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ہندوستانی سیاست پر اسلامی نقطہ نظر سے بیباکانہ تنقید کرنا اس کا طغرائے امتیاز ہے +

قیمت سالانہ پانچ روپے — نمونہ کا پرچہ آٹھ آنے

دفتر رسالہ ترجمان القرآن" لاہور

چند مفید رسائل

اسلام کا نظریہ سیاسی

از سید ابو الاعلےٰ مودودی - قیمت تین آنہ ۲ر

اس رسالہ میں بتایا گیا ہے کہ اسلام میں حکومت کا تصور کیا ہے، اور اس تصور پر جو نظام حکومت بنتا ہے اس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ یہ رسالہ اردو اور انگریزی زبانوں میں بھی مل سکتا ہے ✦

سلامتی کا راستہ

از سید ابو الاعلےٰ مودودی - قیمت تین آنہ

اس رسالہ میں ثابت کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنے کے سوا انسان کے لیے سلامتی کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے انسان کی خود مختاری، یا انسان پر انسان کی حاکمیت سراسر غلط ہے اور اس کا نتیجہ تباہی و ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ✦

اِسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے

از سید ابو الاعلےٰ مودودی
قیمت تین آنہ

اس رسالہ میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی حکومت میں کیا فرق ہے۔ جو طریقے اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لئے آج کل تجویز کئے جا رہے ہیں ان میں کیا غلطی ہے، اور فی الواقع اسلامی حکومت کے وجود میں آنے کی سبیل کیا ہے ✦

ملنے کا پتہ

دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور

مسئلہ قومیت از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ قیمت بارہ آنے ۱۲ر

اس رسالہ میں قومیت کے پیچیدہ مسئلہ پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ دُنیا میں قومیت کی بُنیاد جن چیزوں پر رکھی گئی ہے ان میں غلطی کیا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں؟ قوم پرستی کس چیز کا نام ہے اور اس میں کیا خرابی ہے؟ اسلام کا نقطہ نظر قومیت اور قوم پرستی کے بارے میں کیا ہے اور اسلامی قومیت سے کیا مراد ہے؟ ہندوستان میں متحدہ قومیت بنانا کیوں غلط ہے اور اس کی کوشش کرنا اس مُلک کے لیئے کس قدر تباہ کُن ہے؟ یہ مسائل ہیں جنپر تفصیلی بحث اس رسالہ میں کی گئی ہے۔

مُسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم از سید ابوالاعلیٰ مودودی قیمت عہ ر

اس رسالہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے طرز عمل پر صاف صاف اور بے لاگ تنقید کی گئی ہے اور ان کے انفرادی و اجتماعی رویہ کی غلطیاں واضح کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی رُو سے ان کے لئے صحیح نصب العین اور صحیح راہ عمل کیا ہے۔

اس کے ابتدائی دو حصے پہلے شائع ہو چکے ہیں جن میں ہندوستان اور مسلمانانِ ہندوستان کے موجودہ حالات کا تفصیلی جائزہ لے کر بتایا گیا ہے کہ جو مسائل اس وقت درپیش ہیں۔ اُن کا حل کیا ہے۔ قیمت حصہ اوّل بارہ آنے (۱۲ر) حصہ دوم ایک روپیہ چار آنے (عہ۱)

دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور